خواجہ غلام السیدین
ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

امن و آشتی کا مذہب، اسلام
(I)

اسلام کا پیغام:

مجھے عالم دین ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی ترجمانی کرتے ہوئے بعض اُمور میں عقیدے کی رسمی اور روایتی ڈگر سے ہٹ جاؤں۔ کہیں تو یہ فرق محض کچھ باتوں کو زیادہ اہمیت دینے نہ دینے کا ہوسکتا ہے، کہیں کہیں مستقل بالذات بھی ہوگا۔ مجھے تعلیماتِ اسلامی کے بعض پہلوؤں کی ایسی تاویل دیکھنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے جنھیں میں ذاتی طور پر قطعاً ناقابلِ قبول سمجھتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ چونکہ ایک رائے آج سے ہزار پانسو برس پہلے ظاہر کی جا چکی ہے، لہٰذا محض اپنی قدامت کی بناء پر آج بھی وہ قابلِ احترام ہے۔ مثلاً میرا عقیدہ ہے کہ بہت سے دنیوی امور میں اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس نظریے کے برخلاف بعض فقہاء نے سیاسی اور سماجی معاملات میں غیر مسلم (ذمی) رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک کے بارے میں بعض ایسی شرائط عاید کر دی ہیں جو انسانی مساوات کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں۔ نہ صرف قرآن کے مجموعی اندازِ نظر سے ان کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ یہ انسان دوستی کی روح کے بھی منافی ہیں۔ جب کوئی شخص ایسی کسی تفسیر کے پایۂ استناد کو جانچنا چاہے تو اسے محض یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے ذریعے یہ روایت منتقل ہوئی ہے وہ کہاں تک سچے اور قابلِ اعتبار تھے جیسا کہ اب تک ہمارے علماء کرتے آئے ہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ

روایت اس مذہب کے نظریات کے عام سماجی اور اخلاقی ڈھانچے سے مطابقت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ مثلاً قرآن کا بالکل واضح موقف ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو رواداری، فراخ دلی اور اخوتِ انسانی کے اصول پر مبنی ہو۔ اب اس کے بعد اگر کوئی ایسی حدیث یا اس کی کوئی تاویل ملتی بھی ہے جو مذکورہ بالا تعلیم سے لفظاً و معناً مختلف ہو تو یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ زمانۂ مابعد میں حکمران طبقے کے ان اعمال کا جواز پیدا کرنے کے لیے گڑھی گئی ہوگی جنہیں اور کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ایسی موضوع احادیث اور قرآنی آیات کی تفسیر بالرائے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جنہیں علمائے سوء نے حاکمانِ وقت کو خوش کرنے کے لیے گڑھ لیا تھا۔ ایسے حالات میں مغز اور پوست میں فرق کرنا اُن افراد کی ذمہ داری ہو جاتی ہے جو باشعور ہیں اور صداقت کا احساس رکھتے ہیں۔ اور یہ ایسا حق ہے جو کچھ قیود کے ساتھ اسلام نے ہر شخص کو دیا ہے۔ اسی کو ''حقِ اجتہاد'' کہتے ہیں۔ اسلام نے انسانی زندگی کے روحانی معاملات میں بھی اور مذہب سے علاقہ نہ رکھنے والے مسائل میں بھی، عقل کو ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ قرآن میں فکر اور عقل و مشاہدہ کی ضرورت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

مذاہب کی عموماً غلط تاویل ہوتی ہے تاکہ اس عقیدے کو شہ ملتی رہے کہ انسان کی قسمت تو خدا نے پہلے سے بنا دی ہے اور خدا جس حال میں اُسے رکھنا چاہے بندے کو اس سے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ انسان کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایسے عقائد کے خلاف بار بار بغاوت کرتا رہا ہے جن کی تبلیغ مختلف ذرائع سے ہوتی رہی ہے اور اس طرح انسان اپنے آزادیٔ فکر کے ورثے میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتا رہا ہے۔ مذہب اور اخلاقیات کے میدان میں انسان نے جو پیش رفت کی ہے اُس میں نہ صرف آزادیٔ فکر کا یہ سرمایہ اس کی پشت پر رہا ہے بلکہ یہ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں میں سب سے زیادہ قیمتی اور قابلِ فخر متاع ہے۔

ہر مذہب میں یہ رجحان عام ہے کہ روایت پرست لوگ لفظ کو معنی پر فوقیت دیتے ہیں اور رسوم و عقائد کو بنیادی اور حیات افروز اصولوں سے بالاتر رکھتے ہیں۔ لفظی تاویلات سے ذرا

بھی ہٹنا نہیں چاہتے اور اس کی شرح میں بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔ یہ کسی حد تک مذہبی رہنماؤں یعنی مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی رجعت پرستی کے باعث ہوسکتا ہے لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نئی تحریکوں سے باخبر نہیں رہتے، فکر و خیال کے جدید تقاضوں اور انسانیت کے تازہ تر مسائل و مقتضیات سے غافل رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ عافیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور نئے افکار سے جو خطرات پیدا ہو سکتے ہیں، اُن سے محفوظ رہیں۔

یہی سبب ہے کہ ہر مذہب میں ان لوگوں کی تعداد مختصر ہے جو اپنے مذہب کے دائرے میں بند بھی رہے ہوں اور اُنہوں نے حقِ اجتہاد کا استعمال کر کے نئے افکار بھی پیدا کیے ہوں۔ اس پر دوسرے مذہب والوں کی طرف سے تنقیدی تبصرے بھی ہوئے ہیں جو کبھی کبھی نامناسب حد تک سخت تھے اور یہ عموماً ناراضگی یا مناظرے بازی کی پیداوار تھے۔ روایت پرست علماء کے سامنے دوسرا مقصد اپنے مفادات کا تحفظ اور عوام میں اپنے اثر و نفوذ کو باقی رکھنا تھا۔ اگر کسی مذہب کے پیرو یہ سمجھنے لگیں کہ انہیں مذہبی امور میں آزادیٔ فکر کا حق بھی حاصل ہے اور وہ ان مسائل کو اپنے طور پر سمجھنے میں اپنا دماغ کھپانے لگیں تو مذہب کی تفسیر و تعبیر پر ان روایت پرستوں کی اجارہ داری معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ اس ملک کے بعض دور افتادہ دیہی علاقوں میں تو آج بھی یہ ہوتا ہے کہ ملاجی سال چھ مہینے میں ایک بار وہاں آتے ہیں اور چھری پر کلمہ دم کر کے اپنا نذرانہ لے جاتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے یا سیکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے گاؤں والے اُسی 'پڑھی ہوئی' چھری سے ذبیحہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ انتہائی درجے کی مثال ہے مگر اس سے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کسی مذہب میں اس طرح کے معاملات ہونے لگتے ہیں تو اس کا وہ توانا حصہ جس میں زندگی بخش عناصر اور حرکی قوت ہوتی ہے، گھٹ کر چھوٹی چھوٹی غیر اہم اور بندھی ٹکی باتوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ یہ تمام مذاہب کے لیے ایک زبردست انتباہ ہے کہ وہ خطرے کے نشان تک پہنچ گئے ہیں۔

یہ بات بہرحال مشتبہ ہوسکتی ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی بطور خود شرح کرنے کا

اہل ہوں یا نہیں۔ مگر میں سختی سے اس بات کا حامی ہوں کہ ہر سنجیدہ دیانت دار اور ذہین انسان کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ اس طرح کی نئی تشریح و تعبیر ہر زمانے میں مختلف وجوہ سے ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ جدید دُنیا پر کم سے کم پچھلی دو صدیوں میں ایسے نئے نئے دباؤ پڑے ہیں اور اتنی سماجی، ذہنی اور تکنیکی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے پورے ڈھرّے ہی کو بدل دیا ہے۔ اب مذہب کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ عہدِ حاضر میں اپنے کردار اور دائرۂ عمل کا دوبارہ جائزہ لے اور اس کی نئی تعبیریں پیش کرے۔ اس کے لیے ہم آہنگی اور تطبیق کا رویّہ اختیار کرنا ضروری ہے، جو نئے دَور کی ثنویتوں کو بھی میں رکھے جو بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہیں اور آج کے تضادات میں ایک واضح موقف بھی اپنا سکے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اب مذہب کو بسم اللہ کے گنبد میں بند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عذر نامناسب ہے کہ ان کا ان ارضی اور مادی اُمور سے کچھ سروکار نہیں، اس کا مطمحِ نظر تو صرف آخرت ہے۔ کوئی بھی مذہب ہو، اگر وہ اس 'دوسری دُنیا' والے نظریے کو اختیار کرتا ہے تو یہ اسکی بنیادی صلاحیتوں کا غلط بلکہ شاید جھوٹا استعمال ہوگا اور اسلام تو ظاہر ہے کہ خاص طور پر اس لیے آیا تھا کہ روحانی اور مادی دُنیا کے درمیان دوئی کو مٹا دے۔ وہ تو ایک سچے مسلمان کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ وہ دُنیا اور آخرت کی بھلائیوں (حسنات) کی تمنا اور ان کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوئی طمع نہیں ہے، جیسا کہ ایک ہی وقت میں سب چیزوں کے طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، بلکہ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ دونوں عالم درحقیقت ایک ہی ہیں اور کوئی شخص بھی 'روحانی' ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس دُنیا کی زندگی کو بہتر بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس اس نے اپنی روحانی زندگی کو ایک ضابطے میں نہیں ڈھالا ہے تو وہ اس دُنیا کی زندگی کو بھی نہیں سنوار سکتا اور جو اس دُنیا میں کھو گیا وہ تو پھر کہیں کا نہیں رہا۔ یہی بات اقبال نے اپنے مخصوص نکتہ سنجی کے انداز میں یوں کہی ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

فارسی کے عظیم شاعر مولانا رومؒ نے اسی مضمون کو نئے انداز میں یوں کہا ہے:

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

قرآن کی ایک آیت بھی یہی کہتی ہے:

ومن كان فى هذه أعمى فهو فى الاخرة اعمى و أضل سبيلاً. (بنی اسرائیل: ۷۱-۷۲)

اور جو اِس دُنیا میں اندھا بن کر رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (راستہ پانے میں) اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان کے اچھے یا برے اعمال کے نتائج اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے دُنیا کو 'مزرعۂ آخرت' بھی کہا گیا ہے یعنی جو کچھ ہم یہاں بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔

آج کے انسان پر مذہب کی گرفت، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو، کیوں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے؟ اس کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ ہے کہ آج زندگی پر جو دشواری اور بے یقینی کا ماحول مسلط ہے اس میں مذہب کوئی مؤثر رہنمائی دینے سے قاصر ہے۔ آج کا انسان افلاس، جہالت اور بیماریوں کا شکار ہے، نئی طرح کے توہمات اور تعصّبات کا مارا ہوا ہے، تشکیک میں گرفتار اور استحصال کا ہدف ہے، نسلی، قومی، نظریاتی اور علاقائی عصبیتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ہمہ وقت جنگ، نسل کشی اور کیمیائی و جراثیمی اسلحہ کے استعمال سے تباہی کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ ایٹمی تباہ کاری کا بھوت اسے ڈرا رہا ہے۔ اس کی اچھی اور بری روایتی قدریں مٹا دی گئی ہیں، مگر ان کی جگہ نئی اور حیات بخش قدروں نے پر نہیں کی ہے۔ اس طرح وہ بہت سی منفی طاقتوں کے بیچ میں پھنسا ہوا ہے جنہیں اگر بروقت نہ روکا گیا تو اس بات کا امکان ہے کہ قومی سطح پر خودکشی نہیں تو کم از کم اس کی سماجی زندگی میں شدید رخنے ضرور پیدا ہو جائیں گے۔

مگر ان بے کسی کے حالات میں مذہب کا ساتھ چھوڑ جانا ہی یقیناً واحد سبب اس کی

گرفت کے کمزور ہو جانے کا نہیں ہے۔ بہت سے ایسے مفکر بھی ہیں جنھوں نے پوری ایمانداری سے محسوس کیا ہے کہ کسی مخصوص مذہب سے ان کی وابستگی واقعی ایک دشوار کام ہے، اگر چہ وہ بھی زندگی میں ایسی بہت سی قدروں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر 'مذہبی اقدار' ہی کہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں خدا میں اتنا رحم اور مکارم کا احساس ضرور ہے کہ وہ انھیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے گا جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ 'خدا میں اتنی بردباری ہے کہ وہ پروفیسر آئر (Ayer) اور مالکم مگرج (Malcolm Muggeridge) کے اس قول کو بھی برداشت کر سکتا ہے کہ وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا' مگر کوئی شخص نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے نہ اُسے فرض کر کے آگے بڑھ سکتا ہے کہ 'انسان کا وجود نہیں ہے۔' ان سے بھی بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے مذہب کو اتنی آسانی سے رد کر دیا ہے جتنی آسانی سے اُسے بہتوں نے قبول کر رکھا ہے۔ یعنی بغیر غور وفکر کی زحمت اُٹھائے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تقویم پارینہ ہے، جدیدیت کے خلاف ہے، فیشن سے میل نہیں کھاتا وغیرہ۔ اس گروہ کا معاملہ اور بھی بدتر ہے کیونکہ ان میں قوتِ فکر اور دیانت دونوں کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔

اس شدید بحران کے عالم میں کوئی مذہب یا مذاہب انسان کو کیا دے سکتے ہیں؟ کچھ مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر، جو اُمید گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے گاندھی، شوئیٹزر، مولانا آزاد وغیرہ، مذہب کے حامیوں میں نمایاں طور پر اس بات کا احساس بھی نہیں پایا جاتا کہ اصولِ اخلاق یا نیکیوں کی محض رسمی اور غیر فکر انگیز تبلیغ حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گی۔ عبادات کی کچھ مقررہ ظاہری رسموں کو ادا کر لینا، یا چند ثواب کے کام کر لینا کسی ایسے انسان کے لیے تسکینِ قلب کا موجب ہو سکتا ہے جس کے پاس مذہب اور زندگی کے امکانات کی وسعتوں کا بہت محدود تصور ہو۔ مثلاً اس سے کوئی ایسا دُنیادار شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو زندگی کا بڑا حصہ دولت بٹورنے میں گنواتا ہو، یا حصولِ جاہ کے لیے کوشاں رہتا ہو یا لغو اور سستی لذتوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہو، مگر کبھی کبھی رسمی عبادت گزاری بھی کر لیتا ہو۔ مذہب کی سچی دعوت تو بہت پر معنی اور جچی تلی ہے۔ اس کا مطلب زندگی کو اس کے ان گنت شعبوں کے ساتھ اس طرح بسر کرنا ہے

جیسے انسان ہمہ وقت اپنے خالق کے حضور میں ہے اور اپنی خودی کی عظیم اور ناقابلِ قدر صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك.

(تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو،
اور اگر یہ نہ ہو سکے تو گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔)

اس طرح وسیع ترین مفہوم میں ایک مومن کی ساری زندگی عبادت بن جاتی ہے۔ درحقیقت مذہب کے دو قطعی مختلف تصور ہیں جنہیں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ایک چھوٹی سی نظم میں بیان کر دیا ہے۔ یا تو یہ کائنات کی بیکراں وسعتوں میں خدا کی حمد و ثنا کرنا ہے اور اس کی رضا کو پورا کرنے کی جدوجہد ہے یا یہ زمین کی آغوش میں عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہونا اور خدا سے بے سعی و جدوجہد اپنا مدعا طلب کرنا ہے۔ پہلے تصور کو وہ 'مردِ خدا مست و خود آگاہ' کا مذہب کہتا ہے اور دوسرے کو 'دینِ ملا' یا نباتات و جمادات کے مذہب سے تعبیر کرتا ہے۔ جب میں مذہب کی بات کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ میرا مقصود اس کے دوسرے مفہوم سے نہیں ہوتا۔ یہ اگر اس چیلنج کا سامنا حوصلے اور ضبط کے ساتھ نہیں کرے گا تو زمانہ اسے روند کر آگے نکل جائے گا اور اگر سب لوگ نہیں تو کم سے کم نوجوان مرد اور عورتیں دوسرے زیادہ طاقت ور دھاروں میں بہہ جائیں گے۔

یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اگرچہ اس وقت انسانیت کو ایسے عظیم بحران کا سامنا ہے جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، مگر مذاہب آج بھی اپنے حقیر نظریاتی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں اور ان کی مناظرہ بازی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ دراصل ان لوگوں کو زندگی میں مذہب کے صحیح مقام اور منصب کا اندازہ نہیں ہے۔ ہر شخص خصوصاً ہر ذہین مسلمان کو اس بات سے گہرا قلق ہونا چاہیے کہ اس کے مذہب کے ظاہر و باطن کا تضاد بڑھتا جا رہا ہے۔ مذہب کے لیے کہا گیا ہے کہ 'انسان کی زندگی پر اس کی رضا و رغبت سے خدا کی حکمرانی کا سب سے بڑا

وسیلہ ہے اور یہ تعریف بڑی حد تک اسلام پر صادق آتی ہے، جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے، جو خود بھی ایک مومن کی سچی مثال ہیں، یہ کہلوایا گیا ہے:

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین. (۱۶۲:۶)

(اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ خدا کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔)

اگر ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، اس دُنیا میں بھی اور آخرت کے لیے بھی اور وہ سچے دل سے اپنے ایک خدا پر یقین رکھتا ہے جو اس کی شہ رنگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اور میرا ایمان ہے کہ وہ ہے، تو اس کے لیے سچے راستے سے بھٹک جانے کا کوئی عذر ہونا نہیں چاہیے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ یہ گمراہی بالقصد ہو، یا صراطِ مستقیم سے انحراف و انکار کا نتیجہ ہو۔ یہ اہم باتوں سے بے اعتنائی اور بے حسی یا غیر اہم باتوں میں غیر معمولی انہماک کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے۔ (مجھے ذاتی طور پر ان لوگوں کی بے اعتنائی کا ایک سبق آموز تجربہ ہوا، جو بظاہر دین کا درد رکھتے تھے۔ چند سال ہوئے ٹوکیو (جاپان) میں مذہب اور امن پر عالمی کانفرنس کے انعقاد سے ذرا پہلے میں نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ایسی کانفرنس چند ماہ کے بعد منعقد کرنے کا خیال ہے جس میں تمام مذاہب کے نمائندے اکٹھے ہوں گے اور باہم سر جوڑ کر مشورہ کریں گے کہ وہ قیامِ امن کے مقصد میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ میں نے ان حضرات سے پوچھا تھا کہ اس تجویز کے بارے میں ان کا ردِعمل کیا ہے؟ کیا یہ تجویز انہیں مذہبی نقطۂ نظر سے معقول معلوم ہوتی ہے؟ اور آیا وہ اسے اخلاقی حمایت دینے پر آمادہ ہیں؟ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جتنے اداروں کو سوالنامہ بھیجا گیا تھا ان میں سے صرف ایک نے جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ یہ اتفاق سے ایسا جواب تھا جس میں تجویز کی تائید کی گئی تھی۔ مجھے بہرحال یہ شبہ ہے کہ جس ادارے نے

میرے سوالنامے کا جزوی جواب دیا اُس کا سربراہ برسوں پہلے میرا شاگرد رہ چکا تھا۔ میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ دوسرے اداروں کے جواب نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ وہ امن کے حامی نہیں بلکہ وہ ان باتوں کو ذاتی تشویش کے مسئلوں میں سے نہیں سمجھتے اور یہ باتیں اُن کے محدود مفادات کے دائرے میں نہیں آتیں۔

نیکی کے فروغ میں بااثر لوگوں کی بے اعتنائی اور بے تعلقی برتنے سے دُنیا کو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا اشرار کی شرانگیزیوں سے بھی نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مذہب کی حیثیت سے معاشرتی مسائل کا سامنا کرنے اور حوادث سے پریشان محسوس کرنے میں آج اسلام کی بہ نسبت عیسائیت (بالفاظِ دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائی) کہیں آگے ہے۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے کھلے الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ ہر انسان کو نیک کام میں تعاون کرنا چاہیے اور 'اثم وعدوان' سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگر مذہب اس خوابِ خرگوش سے بیدار نہیں ہوتا، خاص طور پر اسلام جو فی الوقت ہمارا موضوعِ سخن ہے، تو وہ ایک حرکی قوت اور حیات افزاء طاقت بن کر نہیں رہ سکتا جیسا کہ ماضی میں رہا ہے، یا یہ خوش گمانی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں ایسا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب میں آج کی اصطلاحوں میں مذہبی تعلیمات کی تفسیر کرنے کی بات کرتا ہوں تو میرا یہ مدعا نہیں ہوتا کہ جدید سائنس یا ٹیکنالوجی یا فلسفہ و اقتصادیات یا دوسرے شعبہ ہائے علوم اپنے مخصوص میدانوں میں جن باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں انہیں بجنسہٖ مذہب کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کے بعض وکیلوں نے بھی اکثر یہ نظریہ اپنایا ہے، مثلاً ہندوستان میں سرسیّد خاں نے۔ مگر اس میں کچھ کھلے ہوئے خطرے بھی ہیں۔ ایک زمانے میں جغرافیہ داں یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ آج ان کا عقیدہ ہے کہ زمین گول ہے۔ جدید سائنس اس بات کی سختی سے تردید کرتی ہے کہ یہ کائنات چھ دن میں پیدا ہوئی ہے، اُس کا عقیدہ ہے کہ آفرینش کا عمل اربوں سال تک جاری رہا ہے اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی رو سے انسان کا مورثِ اعلیٰ بندر ہے۔ اگر علمائے متقدمین نے یہ سمجھا ہے کہ ابتدائی نظریات مذہب کے

نظریات بھی ہیں تو اب اپنی ذہانت کی قوت سے یہ ثابت کرنا علمائے جدید کا کام ہے کہ صحفِ سماوی کی زمین کو فی الواقع گول ہی بتایا گیا ہے اور کائنات کی تخلیق کا عمل ایک طویل زمانے تک جاری رہا ہے اور بقائے اصلح کا اصول ہی ارتقا کے پیچھے کارفرما رہا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ صحفِ سماوی سائنس کی کتابیں نہیں ہیں جو ان مسائل سے بحث کریں۔ اگر یہ سائنس کی کتابیں ہوتیں تو ہر بار سائنس کے نئے انکشافات اور علوم کی سرحدوں میں نئی توسیع کے ساتھ ہی ان پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو قطعاً ناقابلِ عمل صورت ہے۔

اگر واقعی ان صحف میں ایسے سوالات کا حتمی جواب موجود ہوتا تو اُنہوں نے یا تو سائنس کی تحقیقات اور علوم کی ترقی کا گلا گھونٹ دیا ہوتا یا ان کی شہرت کو بٹا لگا دیا ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عیسائی کلیسا کی غلطی تھی کہ اس کے گیورڈانو برونو (Giordano Bruno) کو بدعقیدہ قرار دے کر اُس کا حقہ پانی بند کر دیا اور اسے زندہ جلوا دیا، محض اس قصور پر کہ اور باتوں کے علاوہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور خود محور کائنات نہیں ہے۔

صحفِ سماوی خواہ وہ اسلامی ہوں یا دوسرے مذاہب کے ہوں بنیادی طور پر الہامی کتابیں ہیں جن کا مقصد مردوں اور عورتوں کو انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی نیک زندگی کی دعوت دینا ہے تاکہ وہ ان اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو پروان چڑھائیں جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور انہیں ایسے کام کرنے کی تشویش اور توانائی مل سکے جو نمایاں طور پر اور صحیح ترین معنوں میں 'انسانیت' کے کام ہیں، جو انسان کو اللہ سے قریب لانے والے ہیں، جن میں انسان کے باہمی رشتوں کی تقدیس کا احساس ہو اور جو تاحدِ امکان خداوندی صفات اور عظمت کے علمبردار ہوں۔ اسی کو ایک مشہور آیت میں تخلقو باخلاق اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی اپنے اخلاق میں خدا کی صفات کا جلوہ پیدا کرو۔

سائنس اور مذہب اصل میں حقیقت کو پانے کے لیے دو الگ الگ راستے ہیں۔ دو جداگانہ طریقے جن سے حقیقت کے مختلف چہروں کی جھلک نظر آتی ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک شخص اسے علمِ خارجی میں معروضی طور پر اور آزادئ فکر کے ساتھ دیکھتا ہے،

دوسرا وجدانی طور پر ادراک کرتے ہوئے اور داخلی سطح پر ان خداوندی ہدایات کی روشنی میں دیکھتا ہے جو اسے اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے ملتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص زندگی اور مذہب کے رشتے کی بات کرتا ہے، زندگی خواہ خام اور سادہ حالت میں ہو یا اپنے کثیر اور شاندار پہلوؤں کے ساتھ، تو اس شخص کو یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مذہب کا بنیادی عمل ایک ایسا پل بنانا ہے جو زندگی کی سادگی اور فطری سلاست کو اس کے مکمل اور شاندار ارقاء سے مربوط کرتا ہو۔ انسان، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، خیر و شر کا ایک ایسا ناقابلِ فہم مرکب ہے جس میں سے کسی عنصر کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر خیر کی طرف نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ وہ پورے عزم کے ساتھ اور بغیر مفاہمت کیے ہوئے شر سے جنگ نہ کرے، خواہ وہ کہیں بھی پایا جاتا ہو۔ شر کی بیخ کنی ہمیشہ کے لیے کر پانا ناممکن ہے بلکہ یہ ایک ایسا کمال ہے کہ ایک بار حاصل ہو جائے تو اس سے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خدا نے اپنے متعدد پیغمبروں کو بنیادی طور پر ایک ہی پیغام دے کر بھیجا مگر ان میں سے کوئی بھی اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے ایک مثالی جگہ بنا دینے پر قادر نہ ہو سکا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے خدا قادرِ مطلق ہے، مگر اس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ زندگی کی کامیابی یہی ہے اور یہی اس کا المیہ بھی ہے کہ خیر و شر کی قوتوں کا یہ تصادم، ایک طرف عظمت کی بلندیوں تک پہنچنے اور دوسری طرف پستیوں میں گرنے کا رجحان، ایک مسلسل دائمی مظہر رہا ہے۔

صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ دوسری تمام اچھی سماجی قوتوں اور شعبوں کو اس مبارک جنگ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ہر نئی نسل از سرِ نو اس جنگ کو شروع کرتی ہے کیونکہ جن مسائل پر قابو پانا ہے اور جن مزاحمتوں کو دُور کرنا ہے، اُن کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ نئی نسل ان سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مذہب یعنی اس کے پیشوا، علماء اور علمبردار اس زندہ اور دلچسپ ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنی ایک عظیم ذمے داری ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ انہیں پھر یہ ماتم کرنے کا جواز بھی نہیں رہتا کہ عہدِ حاضر میں مذہب کی

گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے، جیسا کہ ان میں سے اکثر حضرات کہتے ہیں۔ انہیں اپنے آپ کو تقدسِ مآب بنا کر پیش کرنے کی ذہنیت کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ گویا وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ خلق ان کا اکرام کرے۔ یہ لوگ خاص انداز کا لباس پہن کر یا دقیق اصطلاحوں میں گفتگو کر کے عوام پر اپنے تقدس اور برتری کا رعب ڈالتے ہیں یا روزمرہ کے کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مثلاً خود میں نے بعض علماء کو یہ بحث کرتے سنا ہے کہ سائیکل پر سواری کرنا یا بازار سے سودا سلف لانا اُن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح نے کبھی اس طرح نہیں سوچا نہ ہمارے پیغمبرؐ کا یہ اندازِ فکر تھا بلکہ مشرکینِ مکہ تو ہمارے نبی کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے:

وقالو مال هذا الرسول ياكل الطعام و يمشى فى الاسواق. (۲۵:۷)

(وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو (ہماری طرح) کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا ہے۔)

اسی سورۃ میں تھوڑا آگے چل کر یہ حقیقت بھی بیان ہوئی ہے کہ انبیائے سابقین نے نہ کبھی اپنی امت کے ساتھ گھل مل کر رہنا چھوڑا نہ اپنے آپ کو بزرگ و برتر ہستی بنا کر پیش کیا:

وما ارسلنا قبلك من المرسلين الا انهم ليأكلون الطعام ويمشون فى الاسواق. (۲۵:۲۰)

(اے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے وہ سب کھانا کھانے والے اور بازاروں میں پھرنے والے لوگ ہی تھے۔)

سڑکیں اور بازار اُن پیغمبروں کی تبلیغ کا سب سے پسندیدہ مرکز رہے ہیں۔ خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں یا دوسرے انبیاء ہوں۔ یہ حضرات بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر نہیں بیٹھے تھے بلکہ اگر زندگی کی گہما گہمی سے تھوڑی دیر کے لیے دامن بچا کر خلوت بھی اختیار کرتے تھے تاکہ اپنے نفس اور خالق کا گہرا عرفان حاصل کر

سکیں، تو ان کا یہ خلوت کدہ بھی ایسا بسم اللہ کا گنبد نہیں تھا بلکہ وہ کسی پہاڑی کی کھوہ میں یا شہر کے کسی پرانے قبرستان یا صحرا کے کسی گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھتے تھے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ انبیاء کی اس سنت کو تاریخ کے مختلف اَدوار میں ان کے بعض سچے اور مخلص متبعین نے بھی زندہ رکھا ہے۔ وہ فقر و فاقہ میں رہے ہیں مگر اُنھوں نے دُکھ بھری انسانیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ مسلمانوں میں ایسی بہت سی اعلیٰ درجے کی مثالی شخصیتیں ہوئی ہیں جنھوں نے نوع انسان کی خدمت کو اپنا وظیفہ بنالیا تھا، جو نہ صرف عام انسانوں کی روحانی تربیت کا کام انجام دیتے تھے بلکہ ان کی احتیاج اور نفسیاتی مشکلوں کے وقت میں مادی امداد بھی کرتے تھے۔ وہ پارچہ بانی یا جلد سازی یا کتابتِ قرآن جیسے پیشوں سے اپنی قلیل معاش حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنی روزمرہ کی عبادت و ریاضت بھی جاری رکھتے تھے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ طرزِ عمل عمومی طور پر تمام مذہبی رہنماؤں کی خصوصیات رہا ہے۔ جب تک وہ مذہب کو اس کی صحیح جگہ پر نہیں رکھیں گے یعنی بازاروں میں، عام لوگوں کے گھروں میں بلکہ ان کے دلوں میں اور میدانِ جنگ میں، جہاں ہر طرف خون خرابا ہوتا ہے، تب تک اس کا گہرا اور بھرپور نفوذ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان معاملات ہی سے ان کے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا، ہم ان مسائل سے نہ آنکھیں چرا سکتے ہیں نہ دامن بچا سکتے ہیں۔

درحقیقت یہ بہت ہی دشوار بلکہ خطرناک موقف ہے۔ اس کا مطلب ہے سماج کے اجارہ داروں، ظالم حکومتوں، بااثر اور مالدار لوگوں کے خلاف محاذ بنانا جن سے بصورتِ دیگر سرپرستی بھی مل سکتی ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ مذہب کے سچے پرستاروں نے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، حق کی حمایت میں سینہ سپر ہوکر خطرات مول لیے ہیں۔ لیکن ایسے قابل احترام حضرات اکا دکا ہی ملیں گے۔ کسی مذہب کی صحت برقرار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جس میں نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ عام آدمی بھی شامل ہوں، حوصلہ مندی کے ساتھ شر کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کو میدان میں کود پڑے

جنہوں نے معاشرت پر غلبہ حاصل کر رکھا ہو۔

یہاں ہمارا مقصد اسلام کے تمام پہلوؤں کی مکمل تصویر پیش کرنا نہیں ہے، نہ اس کی ساری تعلیمات کا جائزہ لینا ہے، بلکہ اس کا مقصد محدود ہے یعنی اسلام کے بنیادی پیغام کے بعض ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا جن کا تعلق خاص طور پر عہدِ حاضر کی زندگی سے ہے۔ مجھے یہ دِکھانا ہے کہ بہتر انسان اور بہتر معاشرے کی تشکیل کے لیے اسلام کی جہد مسلسل عہدِ حاضر میں خصوصی معنویت اور جواز رکھتی ہے۔

میں نے اس کوشش کی جرأت اس لیے اور بھی کی ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور مقاصد کے بارے میں آج بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں۔ بعض حالات میں یہ غلط فہمیاں بالکل خلوصِ نیت کے ساتھ ہوسکتی ہیں لیکن اکثر حالات میں یہ تاریخی اسباب سے پیدا ہونے والے تعصّبات یا بے خبری پر مبنی ہیں۔ جہاں تک خود مسلمانوں کے درمیان ایسی غلط فہمیوں کے وجود کا سوال ہے اس کے متعدد اسباب تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فکر اور انتقامی بصیرت کو اچھی طرح استعمال نہیں کیا جس کے ذریعے فروعات اور زوائد کے انبار سے اصلی تعلیمات کی بازیابی ممکن ہوتی جو صدیوں کے طویل عرصے میں ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور کچھ اس کا یہ سبب بھی ہے کہ مذہبی علماء ان کے سامنے اسلام کی توانائی، فعالیت اور عصرِ حاضر میں اس کے پیغام کی معنویت واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ اس کا مغز حاصل کرنے کے بجائے پوست ہی سے بہلے ہوئے ہیں۔ مگر کسی حد تک اس کا سبب مذہبی اقدار سے عہدِ حاضر کی بے اعتنائی بھی ہے۔ ان قدروں کی اہمیت کو یا تو آج کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں اور بزعمِ خویش مذہب کے مفاد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ تاہم مذہب کے مقصدِ اصلی کے بارے میں ان کی بے خبری برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مذہب کے لیے ان کے ایجاب کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں ایک طرف بے اعتنائی اور مایوسی ہے تو دوسری طرف اس کا پیکر مذہبی جنون اور اصلاح دشمنی کا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اسلام کے اصلی خط و خال دِکھانے میں کامیابی حاصل کر سکے اور اس کی تعلیمات

میں جدید دَور سے متعلق کچھ ایسے مضمرات کی جانب اشارہ کر سکے جن کی روشنی میں لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں تو یہ یقیناً ایک مستحسن کام ہوگا۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں بھی اسلام کے بارے میں خوب خوب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ صرف ایسے لوگوں ہی میں نہیں ہیں جو اُن ملکوں میں رہتے ہیں جہاں مسلمان خال خال پائے جاتے ہیں بلکہ ان ملکوں میں بھی ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا وہ خاصی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ عیسائیوں کی مخالفانہ تنقید کے اسباب تو ہم کسی حد تک صلیبی جنگوں کے سلسلے میں تلاش کر سکتے ہیں جب اسلام اور عیسائیت کا براہِ راست مقابلہ نہ صرف تبلیغ کرنے والے دو بڑے مذہبوں بلکہ دو بڑی تہذیبوں کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دَور میں اسلام نے مغربی علوم سے بہت استفادہ کیا، خاص طور سے قدیم ماخذوں میں یونانی زبان کی کتابوں سے۔ اور اس طرح یورپ کے کھوئے ہوئے علمی خزانوں کو گویا مع سود کے انہیں واپس کر دیا۔ پھر اسلام علوم و ثقافت کے مختلف شعبوں کو مالا مال کرنے میں برابر کا شریک رہا۔ لیکن مغرب کے قدیم مصنفین رسول اللہؐ کے بارے میں بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں اور جب کچھ لکھتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ انتہائی توہین آمیز ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے اور بھی افسوس ناک ہے کہ اسلام، جیسا کہ قرآن میں واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے، نہ صرف عیسائیت سے بہت سی باتوں میں مشابہت رکھتا ہے اور اس کے بانی کا اسی طرح احترام کرتا ہے جیسے وہ اسلام ہی کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک ہیں، بلکہ اس نے عیسائی فرقے کے بعض دوسرے افراد کے لیے بھی خصوصی محبت کے جذبات ظاہر کیے ہیں۔

"لتجدن اشد الناس عداوة لِلذين آمنوا اليهود والذين اشركو، ولتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالو إنا نصارىٰ ذالک بأن منهم قسيسين ورهباناً و أنهم لايستكبرون.(۸۲) واذا سمعو ما انزل الى الرسول ترىٰ

اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشٰهدین. (المائدہ: ۸۲-۸۳)

(زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور وہ بول اُٹھتے ہیں کہ پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔)

لیکن یہ افسوسناک غلط فہمیاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ اگرچہ اس میں بعض خصوصاً غیر مذہبی عیسائی مصنفین کا خوشگوار استثناء بھی ہے۔ اُنہوں نے اپنی توجہ اسلام کی طرف مبذول کی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ اس کے باوجود عیسائیوں میں اب بھی اسلام کا ایک مسخ شدہ تصور پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ خیر اور رحم دلی کے جذبات سے عاری ہے اور اسے عام طور پر 'بزورِ شمشیر' پھیلنے والے مذہب کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے جس کا نعرہ یہ ہے کہ کلمہ پڑھو ورنہ موت کے گھاٹ اُترو۔ یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے رویّے پر بحث کرتے ہوئے فان گروم بوم (Von Grunebaum) جیسا بلند مرتبہ عالم بھی کہہ اُٹھتا ہے:

''دُنیا مردِ مومن کا حق ہے۔ اس پر ان فرقوں کے کچھ حقوق تو ہیں جن کے پاس وحی الٰہی کا کچھ حصہ موجود ہے لیکن مشرکین کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اسلامی شریعت نے بت پرستوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ چھوڑا ہے کہ یا تو وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیں یا پھر موت کے گھاٹ

اُتر جائیں۔''

دوسرے مذاہب سے اسلام کے تعلقات پر ہم آگے چل کر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔ یہاں تو سردست ان قابلِ افسوس غلط تعبیروں کی طرف سرسری اشارہ کرنا ہی مقصود تھا۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ امریکہ میں ایک کتاب ''Paths of Life'' (زندگی کے راستے) شائع ہوئی تھی جس کے مصنف چارلس موریس ہیں۔ اس میں ایک باب کا عنوان ''طریقِ محمدی (ﷺ)'' بھی ہے جو غلط فہمی اور غلط ترجمانی کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسلام نے تمام مسلمانوں کو صرف دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی مومن اور کافر۔ (جنہیں یہ مصنف مسلم اور غیر مسلم کے مترادف سمجھتا ہے)، پھر کہا گیا ہے کہ اسلام ہر ثواب کو مومن کے لیے اور ہر عذاب کو کافر کے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ بھی سب کی طرح ایک بشر ہیں، بس اتنا فرق ہے کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آتی ہے، انہیں یہ مصنف اسلام کے نزدیک ''نیم خدا اور نیم بشر'' بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''جو کافر کلمہ پڑھنے سے انکار کریں، ان سے مسلسل جدال و قتال کرو، دشمنی رکھو، اور انہیں موت کے گھاٹ اُتار دو۔''

قرآن نے خدا کو رحمٰن و رحیم کہا ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ایسی ہی ربانی صفات پیدا کریں اور خود آپؐ کی مبارک زندگی کا اسوۂ حسنہ بھی یہی رہا ہے۔ مگر چارلس موریس اسلام میں اللہ کے تصور کو محمدؐ کی شخصیت کا اظلال ہی سمجھتا ہے اور اس کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ اس کی ناواقفیت کے سوا گندے ذہن کی غماز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کے استعمال پر دوسرے تمام انبیاء سے زیادہ اصرار کیا ہے (جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بحث کریں گے) لیکن اس مصنف کا خیال ہے کہ آپ کی زندگی میں منطق کا کوئی گزر نہ تھا۔ اللہ کا یہ بندہ جس نے اپنی زندگی کی طویل ساعتیں غارِ حراء میں مراقبہ و مناجات کرتے ہوئے گزاری تھیں، جو روزانہ عبادت میں طویل

قیام وقعود کرتا تھا، اس مصنف کے نزدیک ایسی شخصیت ہے جس کے یہاں خلوت، ترک وتجرید، یا اعتدال پسندی بالکل اجنبی صفات ہیں۔ اس نے آپ کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتی تھی۔ ایسی متعصبانہ نظر ہو تو اس کا یہ سمجھنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ''دوسرے انسانوں کو مسلمان صرف ایک دہشت، ایک بلائے ناگہانی یا ایک خونخوار درندے کی شکل میں نظر آتا ہے۔'' آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت ان کے رہنما، ان کی جماعت اور دشمن کے مقابلے میں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے حریفوں کو نیست ونابود کرنے کی فکر میں لگے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کم از کم زمانۂ ماضی میں انہیں کبھی ایسی مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوسکی جس کے بعد بس وہی وہ باقی رہ جائے۔ ہٹلر نے ساری تحریک اسلام کو اپنے ایک ہی عمل میں دکھا دیا۔ اس کا موازنہ حضرت محمدؐ سے تقریباً جزوی تفصیلات میں بھی مکمل ہے۔ مین کیف (Mein Kampf) کو آج کا قرآن سمجھنا چاہیے۔''

میں نے اس کتاب سے تین اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ میں اس کتاب کو کچھ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آج بہت سے روشن خیال عیسائی بھی اس نظریے کو مکمل طور پر رد کر دیں گے۔ مجھے تو یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ بیسویں صدی کے روشن عہد میں بھی اندھا تعصب ایک ایسے شخص کے دماغ پر کس طرح قبضہ کرسکتا ہے جسے بظاہر 'تعلیم یافتہ' سمجھا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس مصنف نے اسلام کی معقول ترجمانی کرنے والے عیسائیوں کی تصانیف کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ قطعاً غیر متعصب مآخذ، قرآنِ کریم یا سیرۃ نبوی کے بارے میں تو وہ یقیناً بالکل نابلد ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کتاب جس میں دوسرے مذاہب کا تذکرہ بھی ہے کم از کم اسلام کے معاملے میں تو قابلِ رحم حد تک جاہلانہ ہے۔ مگر یہ شائع ہوئی ہے اور اسے ہزاروں انسانوں نے پڑھا ہوگا۔ ان میں کچھ پڑھنے والے بھی اسلام سے ایسے ہی نابلد ہوں گے جیسا کہ یہ مصنف ہے اور وہ ان بیانات کو محض اس لیے سند بنا سکتے ہیں کہ انہوں

نے ''کتاب میں پڑھا ہے''۔ جو لوگ مذہب کی اہمیت اور شخصیت سازی میں اس کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں انہیں اس طرح کے ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جب تک اس کی بیخ کنی نہ ہوگی حقیقی مذہب ہماری زندگی پر اپنا اثر نہیں ڈال سکے گی۔ بہت سے ہندو بھی اسی طرح اسلام کی حقیقی روح کے بارے میں شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں جس کے کچھ سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے زمانۂ وسطیٰ اور عہدِ جدید میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے سیاسی جھگڑوں نے تعصب کی آگ کو دونوں طرف بھڑکایا ہے۔ تعصب کی عینک لگا کر کسی مذہب یا تاریخ کے بارے میں صحیح اور غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ اس کے سوا یہ سبب بھی ہے کہ کبھی کبھی مسلمانوں نے بھی اپنی مسخ شدہ اور مکروہ تصویر کشی پیش کی ہے اور مسلمان حکمرانوں نے فوجی چڑھائیاں اور فتوحات کرنے میں ایسی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کیا ہے جو قطعاً اسلام کی روح کے منافی تھا۔

یہاں یہ سوال یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کون سا ہے جس کے پیروؤں نے اس طرح کے بلکہ کبھی ان سے بھی بدتر اعمال نہ کیے ہوں لیکن یہ الزامی جواب میرے نزدیک کوئی تسلی بخش موقف نہیں ہے۔ تنقید کرنے والوں نے بہرحال مسلمانوں کے اعمال میں اُن کے عقائد کی جھلک دیکھی ہے۔ میرا عندیہ یہ ہے کہ ایسے معاندانہ تجزیے میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مخالفوں یا نکتہ چینوں سے زیادہ ذمہ دارانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ اُن کا کام یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں رچا کر اپنے مذہب کی اچھی اور لبھانے والی تصویر پیش کریں۔ یہ کہنے کے بعد مجھے پہلی بات کو دہرانا ہے کہ الزامی جواب ایک غلط اور عاقبت نااندیشی کا فیصلہ ہوگا۔ اگر تمام مذاہبِ عالم پر ایسی ہی تنقید ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے سب مذاہب کے تصور کو گزند پہنچتا ہے۔ مذاہب کے مطالعہ ان کی بہترین تعلیمات کی روشنی میں کیا جانا چاہیے جو وہ نہ صرف اپنے مخصوص پیروؤں کے لیے بلکہ مجموعی طور پر ساری انسانیت اور تمام عالم کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر وہ کون سا عظیم اضافہ ہے جو ان میں سے تمام مذاہب

نے نیکی اور رحم دلی کے جذبات کو فروغ دینے کے سلسلے میں کیا ہے؟ یا جس سے سماجی انصاف کے نظریات کو تقویت ملی ہے اور عام آدمی کو زندگی کی سختیاں جھیلنے میں آسانی ہوگئی ہے، یا جس سے عمومی طور پر انسانی کردار میں اس خیر وشر کی جنگ کے لیے تاب مقاومت پیدا ہوئی ہے، جو اسے ساری زندگی میں اور ہر زمانے میں اور بار بار لڑنا پڑتی ہے۔ اگر ان مذاہب کے پیروؤں نے اپنی عظمت کو کھو دیا ہے تو اس کا سبب ان کی کوتاہ بینی اور کمزوریاں ہیں یا یہ ہے کہ وہ اپنی جبلت بہیمیت سے بلند نہیں ہو سکے ہیں لیکن دوسروں کو سنگ سار کرنے میں پہل کون کر سکتا ہے؟ میرا مقصد تو یہ ہے کہ اسلام کی دعوت وعزیمت کو جیسا میں نے سمجھا ہے اسے دوسروں کو بھی خواہ وہ مسلمان ہوں یا کسی دوسرے بڑے مذہب کے پیرو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آمادہ کر سکوں!

میری یہ خواہش صرف اس لیے نہیں کہ خود مجھے اسلام سے یا اس کا دفاع کرنے سے دلچسپی ہے۔ مجھے دُنیا کے دوسرے مذاہب کی مفاہمت اور ان کے پیروؤں کے ہمدردانہ مطالعے کو فروغ دینے کے مسائل سے بھی اتنی ہی دل چسپی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مذاہب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی نیت سے فوجوں کی طرح صف آرا کھڑے رہیں۔ یہ تو خود مذہب کی روح کے بھی منافی ہے۔ ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان مذاہب میں مماثلت اور مشابہت کے گہرے اور بنیادی عناصر موجود ہیں خواہ وہ ایک سطحی یا متعصّبانہ مطالعہ کرنے والے کو ہمیشہ دکھائی نہ دیتے ہوں۔ تاریخ کے ہر دَور میں مذہب کا نشوونما ایک مسلسل تحریک کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ گویا متعدد خدا تھے، ہر ایک کا اپنا اپنا علاقہ بنا ہوا تھا اور وہ اپنے اپنے ماننے والوں کو مختلف اور متضاد احکام بھیجتے رہے۔ قرآن کا کہنا تو یہ ہے:

لو کان فیھما آلھتین الا اللہ لفسدتا. (۲۱-۲۲)

(اگر (زمین اور آسمان میں) ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو فساد یقینی تھا۔)

یہ ایسا نکتہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کسی بھی مذہب کو اسے قبول

کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تمام مذاہب کا سرچشمۂ فیضان ذات خداوندی ہی ہے اور اسی نے اپنا پیغام اپنے برگزیدہ بندوں کی وساطت سے مختلف اَدوار میں مختلف اقوامِ عالم کی طرف بھیجا ہے تو اس پیغام کو لازمی طور پر ایک بنیادی وحدت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات یا رسوم کا اختلاف ہوسکتا ہے، کیونکہ مادی یا سماجی حالات زمان و مکان کے لحاظ سے خاصے مختلف رہے ہیں لیکن زندگی کی اخلاقی اور تہذیبی بنیادیں اچھے اور باعزت کردار کے اصول، سماجی رشتوں کو چلانے والے ضابطے، اساسی طور پر متضاد نہیں ہو سکتے۔

لیوس ممفرڈ (Lewis Mumford) نے اپنی بصیرت افروز کتاب ''طرزِ زندگی'' (Conduct of Life) میں، جس کا میں نے پہلے بھی کہیں حوالہ دیا ہے، ایسے اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں جو قدیم مذاہب میں مشترک ہیں۔ ان میں شہادت اور بقائے دوام کا وہ نظریہ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انسان دُنیا کے وقت مفادات اور ذاتی اغراض کو کسی بڑے نصب العین کی خاطر قربان کرسکتا ہے اور اسی اعتقاد کی وجہ سے اس کو بہت سی جاوداں رہنے والی کامیابیاں حاصل ہوسکی ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کے لیے صرف دنیوی علائق اور وقتی مفادات سے خاص طرح کی بے تعلقی ہی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ کبھی کبھی یہ سمجھ کر بھی عمل کرسکتا ہے جیسے واقعی اس کی زندگی جاوداں ہوگئی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اسی بات کو یوں کہا ہے:

دنیائے دنی سرائے فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آگے چل کر ممفورڈ اشارہ کرتا ہے کہ جدید علمِ حیاتیات کے تصدیق کرنے سے بہت پہلے مذہب نے زندگی کے حیرت انگیز تار و پود کا وہ تصور پیش کر دیا تھا جس کی رو سے تمام جاندار مخلوقات ایک دوسرے کے سہارے زندہ ہیں۔

> ''زندگی میں باہمی انحصار کی حقیقت اور انسان کے لیے کائنات کے مسخر کیے جانے کا مذہب نے ایک مجمل خاکہ پیش کیا تھا۔ پچھلی تین صدیوں میں سائنس نے اپنی متنوع تفصیلات سے محض اس

اجمال کی بنیادی باتوں کی تصدیق کی ہے اور اس خاکے میں بوقلموں رنگوں کی آمیزش سے خالی جگہوں کو پُر کیا ہے۔''

مذاہب نے انسان پر زندگی کے بنیادی تقدس کا اثر بھی چھوڑا ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جس کا دامن موت کے بحران سے بندھا ہوا ہے۔ کوئی متوازن نقطۂ نظر تلاش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی اور موت دونوں کو اپنایا جائے۔ خود زندگی بھی خوشی اور غم، آسائشوں اور مصائب کے تانے بانے سے بنتی ہے۔ مذہب کے وسیع نقشے میں انسان کو اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے کہ وہ موت کی کہنہ کو صرف ترکِ علائق اور ایثار پیشگی کے پس منظر میں سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مذہب انسان کو ضروریات اور خواہشوں کو محدود رکھنا اور ان پر قابو پانا نہ سکھاتا تو وہ علائق میں اسیر ہو کر رہ جاتا اور اس طرح اپنے ارتقاء اور حقیقی آزادی کے حصول کی صلاحیت کھو بیٹھتا۔ یہ سب کسی ایک مخصوص مذہب کی دین نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کو مالا مال کرنے میں مجموعی طور پر 'مذہب' کا حصہ ہے اور مذہب کی یہ تحریک جوں جوں بڑھتی رہی ہے، اس نے ہمیں انسان کے تجربات، خواہشات اور امکانات کو سمجھنے کے لیے جدید تر اور بعض اعتبار سے زیادہ گہری بصیرت عطا کی ہے۔ انسان کی زندگی پر اپنا پورا اثر ڈالنے سے مذہب کو اس رجحان نے روکے رکھا کہ وہ اپنے چاروں طرف حفاظت اور علیحدگی پسندی کی دیواریں کھڑی کر کے اپنی جداگانہ اور ایک دوسرے سے حسد کرنے والی مملکتیں بنانے لگ گئے، جنہیں اپنی بہبود کی سوچنے سے زیادہ دوسری مملکتوں کو نیچا دکھانے کی فکر رہی۔ ان مناقشوں نے تاریخ کا چہرہ بھی مسخ کیا ہے اور یہ جھگڑے مختلف مذہبوں ہی میں نہیں بلکہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی رہے ہیں۔

جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے، دوسرے تمام مذاہب میں صداقت کے عنصر کا اعتراف کرنا صرف سمجھداری یا رواداری کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ حقیقت میں ایک مذہبی حکم ہے جسے کوئی مسلمان اپنے روحانی نقصان کی قیمت پر ہی نظرانداز کر سکتا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ قرآن اور حدیث میں اس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے کہ خدا نے تمام قوموں کی

طرف انبیاء مبعوث کیے تھے جن میں سے صرف بعض کا نام لیا گیا ہے اور بہتوں کا نام نہیں آیا ہے نیز یہ کہ پیغمبر اسلام ان انبیائے سابقین کی تکذیب کرنے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے پیغام اور تعلیمات کی تصدیق و توثیق کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کا احترام اور تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام ہر مسلمان پر واجب کیا گیا ہے۔

بعض حالات میں کچھ فرماں رواؤں یا فاتحوں نے جو کچھ بھی کیا ہو، اسلام میں غیر مذہب کے ماننے والوں بلکہ منکرینِ مذہب کی بھی کسی طرح کی توہین یا ان سے بدسلوکی کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگرچہ اسلام سختی سے توحید پرست مذہب ہے اور شرک یا بت پرستی کا شدت سے مخالف ہے مگر اپنے پیروؤں کو اس نے یہ حکم دیا ہے:

ولا تسبّوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم كذلك زيّنا لكل امة عملهم ثم الى ربهم مرجعهم فينبئهم بما كانوا يعلمون. (۱۰۸:۶)

(اور (اے مسلمانو!) تم انہیں گالیاں نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں کیونکہ پھر یہ لوگ جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔)

پھر اگر یہ لوگ خدا کی توہین کریں تو مسلمان جو خود ان کے معبودوں کو برا کہتے ہوں، اس بات پر بگڑنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتے۔ کوئی مسلمان خواہ اس کا دنیوی یا مذہبی رتبہ کتنا ہی بلند ہو، اگر ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گویا وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کی صریح نافرمانی کرتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور غور کریں کہ وہ فکرِ انسانی کو روشن تر بنانے، باہمی مفاہمت کو فروغ دینے، اور بھائی چارے کا احساس پیدا کرنے میں کیا واقعی مدد کر رہے ہیں؟ یہی وہ اعلیٰ مقاصد ہیں جو اسلام کو روزِ اوّل سے عزیز رہے ہیں۔

مزید برآں، مختلف مذاہب کے درمیان اقدار اور نظریات کے تبادلے کے امکانات کو محدود کرنا یا ایک ہی مذہب (یا رنگ و نسل یا قوم و قبیلہ) کے پیروؤں کے درمیان مکالمے پر

پابندی لگانا انسان کے روحانی ارتقاء کی رفتار میں سخت رکاوٹ کا باعث ہے۔ ایسی پابندیاں خیالات، عقائد اور آراء کے بہاؤ کو روکتی ہیں اور اس سے ذہنی تجسس کا وہ ارتقاء بھی رُک جاتا ہے جو تلاشِ حق کے لیے اُکساتا ہے اور خیالات کی پراگندگی کو ختم کرتا ہے۔

ہمارے عہد میں جب کہ صرف اشیاء اور اشخاص ہی نہیں بلکہ علوم اور نظریات و افکار اور ہر میدان کے تخلیقی کارناموں کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے وسائل خاصے تیز اور مؤثر ہیں، یہ تنگ نظری اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے۔ تجدد کے مخالفین، افکار و اعمال کے بہت سے میدانوں میں جو دیواریں کھڑے کر رہے ہیں، آج کے زمانے میں ان کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ (مثال کے طور پر دیکھیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی مفاہمت اور رسل و رسائل کی دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ صرف سیاسی معاشرتی اور اقتصادی سطح پر ہی لین دین بند نہیں ہوا ہے بلکہ رسالوں، کتابوں، شاعروں، اسکالروں اور کھلاڑیوں کی آمد و رفت سے علمی اور ثقافتی میدان میں جو تبادلہ ہوتا تھا وہ بھی بند ہو چکا ہے۔)

لہٰذا ہمیں اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں اور دروازے ہر اس بات کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں جس سے زندگی مالا مال ہے یعنی ہمارے خیالات اور قدریں، ہماری سائنس اور آرٹ، ہمارا فلسفہ اور عقائد، خواہ وہ ہمیں کسی بھی جگہ سے ملیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک فرمان پر کہ **الحکمة ضالة المومن فلیاخذها این وجدها.** (دانائی کی ہر بات مومن کی متاعِ گمشدہ ہے، جہاں بھی ملے اُسے حاصل کرے۔) اور **اطلبوا العلم ولو بالصین.** (طلبِ علم کرو خواہ وہ چین میں ملے۔) سچے دل سے عمل کر کے اسے اپنے اعمال میں رچا بسا لینا چاہیے صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہ ہوگا۔

مذہب کی دنیا میں بھی جہاں لوگ اکثر ضرورت سے زیادہ متعصب یا تحفظ پسند ہو جاتے ہیں ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ اگر ہم دوسرے مذاہب کے صحت مند تصورات کا خوش دلی سے استقبال کرنے کو آمادہ رہیں تو اس سے ہمارے اپنے مذہب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوگی کیونکہ آخر دوسرے مذاہب کا سرچشمہ بھی ذاتِ خداوندی ہی ہے۔ عام طور پر مدرسہ ہائے فکر

ہوں، یا فلسفہ وعقائد کے دبستان، یہ اتنے بودے اور شکی ہوتے ہیں کہ غیروں کے خیالات و عقائد سے میل جول بڑھانے سے ڈرتے ہیں، اُن کا عام رجحان محدود اور بند ہو کر رہنے کا ہے اور وہ دوستانہ مکالمے یا تقابل کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے انہیں اپنے اندازِ نظر میں تبدیلی پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے یا اس طرح کچھ ایسے نئے سوالات سامنے آ سکتے ہیں جو ان لوگوں کو ناگوار گزریں جو حق کے تنہا اجارہ دار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ یہ لوگ حق پر ہونے کا دعویٰ ضرور کریں مگر انہیں یہ حق نہیں کہ شبہات اور سوالات کو پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ رویہ سماجی اور طبیعی علوم میں معقول نہیں سمجھا جاتا تو اسے مذہب یا فلسفے میں کیوں معقول سمجھا جائے؟ کسی زندہ اور نامیاتی مذہب کو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب سے یا جدید افکار سے ایک بارآور مکالمے کی ابتدا نہ کرے۔ ان میں سے بعض افکار کو وہ قبول کر سکتا ہے اور بعض کو رد کر سکتا ہے مگر بشمول اسلام اگر کوئی مذہب بھی اچھی طرح سمجھے پرکھے بغیر ان افکار کو رد یا قبول کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اسلام کے پاس عصر حاضر کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اسے اپنے پیروؤں کے سامنے بھی اپنی تعلیمات کو دانش مندی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے اور انہیں انسان کی فکری میراث کے مشترک خزانے میں بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ اس طرح اگر دوسرے مذاہب کے مرد وزن شعور یا غیر شعوری طور پر اسلام کے کچھ اصول ونظریات کو اپنے افکار میں جذب کر سکیں، جیسا کہ تاریخ کے ارتقاء میں ہوا بھی ہے تو کیا خدا کے مقصدِ ہدایت میں اس کی کچھ اہمیت ہوگی کہ وہ لوگ ان نظریات کے اصل مصدر اور ماخذ کا اعتراف بھی کرتے ہیں یا نہیں!

قرآن نے بار بار کہا ہے کہ نجات اور فضیلت کسی خاص مذہب کا اجارہ نہیں ہیں اور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو مذہب کے اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خدا ان سب کا احتساب عدل و انصاف کے ساتھ کرے گا کیونکہ اس نے اپنی

سب مخلوق کے لیے جزا و سزا کا ایک ہی معیار رکھا ہے۔

اسی طرح اگر اس بات کی صحیح ترجمانی ہو کہ عہدِ حاضر کے سامنے مذہب کو کس طرح پیش کیا جائے اور اس کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے کن قدروں پر زیادہ زور دیا جائے اور دوسرے مذاہب اور ان کے رہنماؤں کے تجربات مسلمانوں کے تجربے میں کچھ اضافہ کرنے والے ہوں، تو اس کا بھی کھلے دل سے استقبال ہونا چاہیے، نہ یہ کہ اسے حقارت سے ٹھکرایا جائے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا کہ ''جو ملاتا ہے وہ دھرم ہے جو توڑتا ہے وہ ادھرم ہے۔'' اور اسلام کا عظیم ورثہ یہی ہے کہ اس نے امن اتحاد اور ساری نوعِ انسانی سے ہمدردانہ تعلق رکھنے پر زور دیا ہے۔

جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں ان کی رُو سے ۱۹۶۸ء میں مسلمانوں کی آبادی ساری دنیا میں کم از کم ۵۰ کروڑ تھی۔ 'انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تصنیف 'اسلام' کی رُو سے یہ تعداد کم از کم ۵۰ کروڑ ہوتی ہے۔ اگر عیسائیوں کے تمام فرقے کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور راسخ العقیدہ مشرقی چرچ وغیرہ کو ملا کر دیکھا جائے تو عیسائیوں کے بعد مسلمانوں کا نمبر ہے۔ باعتبارِ تناسب یہ دنیا کی کل آبادی کا بہت بڑا حصہ ہے اور دوسری بہت سی اہم وجوہ کے علاوہ مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ساری دُنیا کا فائدہ اسی میں ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا جائے اور اُنہوں نے انسانیت اور فکر و تہذیب کے ارتقاء کے لیے، یا زمین پر زندگی کا ماحول صالح بنانے کے لیے جو کچھ کیا ہے یا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کا اعتراف کیا جائے (میں یہی بات اجمالاً دنیا کے دوسرے تمام مذاہب کے لیے بھی کہتا ہوں)۔ اسی طرح مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دوسرے عالمی مذاہب پر غور کریں کہ اُنہوں نے دنیا کو بالفعل کیا دیا ہے اور بالقوۃ کیا دے سکتے ہیں؟

انصاف، ہمدردی اور ہر اہم اور حیات بخش چیز کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے لیے آمادگی کا ایسا رویہ زمین پر امن و آشتی کی ضمانت کے لیے کافی نہیں تو ضروری یقیناً ہے کیونکہ اس کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ ایسے لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں جو مختلف

مذاہب میں ناروا داری، تعصب اور رسا کشی کو خوبی کی بات سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے یا منشائے الٰہی کی صحیح ترجمانی کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ تو برہما، گاڈ، یزداں، یا اللہ کا بہت ہی پست تصور ہوگا کہ ہم اس ذاتِ بے ہمتا سے ایسے مقصد و منشاء کو منسوب کرنے لگیں جسے کوئی مہذب انسان بھی اپناتے ہوئے شرم محسوس کرے گا۔

آفاقی انسان کا تصور:

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے آفاقی انسان کے تصور کو اُجاگر کرنے میں مدد دی ہے۔ انسانی تاریخ میں دو رجحان کارفرما رہے ہیں اور ان دونوں میں ہمیشہ سے رسا کشی بھی ہوتی رہی ہے۔ انسان جب تاریخ کے منظر پر آیا تو وہ اپنی زمین، جغرافیہ اور موسم کے بندھن میں جکڑا ہوا تھا اور بے شمار صدیوں تک ان حالات میں اسیر رہنے کے بعد اب ان بندھنوں کو کچھ کچھ ڈھیلا کر سکا ہے۔ موسم کے سرد و گرم ہونے کا اختلاف، زمین کی زرخیزی میں کمی بیشی، آزاد پھرنے والے چوپایوں کا پھیلاؤ جو اکثر انسان سے زیادہ طاقت ور تھے، ان میں سے کوئی بات بھی زندگی کے اُس توازن کو کسی وقت بھی درہم برہم کر سکتی تھی جسے انسان نے بڑی مشقت کے بعد حاصل کیا تھا۔

لاکھوں برس میں انسان نے بستیاں بسا کر قبائل کی صورت میں رہنا سیکھا، جہاں اپنے اور مویشیوں کے لیے غذا حاصل کر سکے اور اُس کا ذخیرہ بھی رکھ سکے۔ یہاں اس نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنائے جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غراتے رہتے تھے کیونکہ مشکل سے حاصل ہونے والے غذا کے وسیلوں پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے جھگڑا ہونا ناگزیر تھا۔ اُس عہد کے انسان کی وفاداریاں صرف اپنے قبیلے کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ قبائلی رسوم و رواج میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ اس کا اخلاق اور کردار بھی قبیلے کے طرزِ زندگی سے تشکیل پاتا تھا۔ آسٹریلیا کے ایک قدیم وحشی قبیلے میں یہ رسم ہے کہ جب قبیلے کا سردار جنگل میں ٹہلنے کو نکلے تو قبیلے کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ زمین پر دراز ہو جائے۔ ان کے آباواجداد جو کچھ کرتے رہے ہوں، اُسے اُن کی نگاہ میں ایک طرح کا تقدس حاصل ہو جاتا تھا، پھر وہ طویل زمانے تک ان کے خیالات اور

روایات کی تقلید کرتے رہتے تھے اور ایسا کرنے کے لیے یقیناً تھوڑا سا جواز بھی موجود تھا کیونکہ ان کی دُنیا چاروں طرف سے بھانت بھانت کے معلوم اور مجہول خطروں میں گھری ہوئی تھی اور انہیں گزرے ہوئے لوگوں کی حکمتوں سے ہی جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ لیکن جب ذہن اس رویے میں پختہ ہو جاتا ہے تو یقیناً ترقی کی راہ مسدود ہونے لگتی ہے۔ ایسا ذہن رجعت پسند ہوتا ہے، حالت موجودہ میں کوئی انقلاب نہیں چاہتا اور رسوم و روایت کی بالادستی پر اصرار کرتا ہے۔ جدت خواہ اعمال میں ہو یا افکار میں، اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ ذہنیت دُنیا کے سبھی علاقوں اور تہذیبوں پر صدیوں تک حاوی رہی ہے اور آج تک بھی ہے۔ حق کو تلاش کرنے اور اُسے قبول کرنے کی راہ میں اکثر یہی بھاری پتھر ثابت ہوتی ہے۔ قرآن اس ذہنیت سے بار بار خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سابقہ امتوں کی طرح عرب کے اصنام پرست بھی حضرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے جواب میں یہ کہتے ہیں:

> ''اور جب کہا جاتا ہے اُن کو کہ آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے؟'' (المائدہ، ۵:۱۰۴)

اسلام کا نہایت واضح نظریہ ہے کہ طریقِ آباء کی آڑ لے کر کسی حقیقت یا برتر صداقت کو جھٹلانا غلط اور غیر منصفانہ ہے۔ قرآن اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے:

> ''ایمان والو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا، تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جب کہ تم ہوئے راہ پر۔ اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو، پھر وہ جتا دے گا تم سب کو جو کچھ تم کرتے تھے۔'' (المائدہ:۱۰۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساری دُنیا ہٹ دھرمی اور باطل پرستی کی راہ اختیار کر لے

تب بھی یہ ہمارے لیے اتباع کرنے کا جواز نہیں ہوسکتا۔ حق جہاں بھی ہو اس کے لیے ثابت قدم ہونا چاہیے کیونکہ ہر فرد آخرت میں اپنے کردار کا خود جوابدہ ہوگا۔

کاروانِ تہذیب آگے بڑھتا رہا اور انسان آہستہ آہستہ قبائلی دَور سے نکلا، اس نے اپنے آپ کو زیادہ بڑے گروہوں میں منظم کیا۔ گاؤں، قصبے، شہر، ملک اور بادشاہت کی تشکیل کی۔ اب اس کے فکر وعمل کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور نئے حالات نے مہذب زندگی گزارنے کے نئے تصورات کا تقاضا کیا۔ نئی قانون سازی ہوئی، جھگڑوں کو طے کرنے کے نئے ذرائع ڈھونڈے گئے، آئے دن پیچیدہ تر ہوتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسیلوں کی مانگ بڑھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دیدہ ور شخصیات نے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، مسلسل کوشش کی ہے کہ وہ نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے طرزِ فکر اور نظریات کی جدید تنظیم کریں اور بعض پہلوؤں سے انہیں خاص کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اب وہ پرانی قبائلی وفاداریاں نئے قومی نظریات میں بدل گئی ہیں اور ایک نیا ابھرتا ہوا احساس ''عالمگیر انسانیت'' (ورلڈ کمیونٹی) کا بھی ہے جسے عہدِ حاضر کی مشینی ترقیوں نے صرف خوش آیند ہی نہیں بلکہ ضروری بنا دیا ہے۔

اپنی بدعنوانیوں اور رجعت پسندی کے باوجود، مذاہب نے اس تبدیلی کے لانے میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔ اتنا اہم کہ درحقیقت مذہب کی وجہ سے یہ بیل منڈھے چڑھ سکی ہے، لیکن یہ ایک دائمی اور مسلسل جدوجہد ہے۔ جو علاقہ فتح کیا جائے اُس کی حفاظت بھی پوری چوکسی کے ساتھ کرنا پڑتی ہے کیونکہ ایسی بہت سی طاقتیں ہیں جو ان کامیابیوں کو خاک میں ملانے کے دَر پے رہتی ہیں۔ بعض لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض ۲۰ویں صدین کے بارے میں سوچتے ہیں کہ اب ظلم وتعدی اور مطلق العنانی کا زمانہ گزر چکا ہے، مگر پھر بھی کوئی ہٹلر، کوئی مسولینی، کوئی اسٹالن، خاص مغربی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور بدترین قسم کی بربریت کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے۔ یا مثلاً آج سے صدیوں پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محبت اور رحم دلی کے پیغام کی تبلیغ کی تھی اور جب یہ مذہب دُنیا کے بڑے حصے میں شائع ہوگیا تو اسی مذہب کے رہنماؤں کے زیرِ اقتدار عدالت احتساب (Inquisition) نے اسے کوڑوں، شکنجوں اور آگ

کی بھٹیوں کے روپ میں بدل دیا۔ یہ پکڑ دھکڑ جو اکثر ایک ہی مذہب کے پیروؤں کے درمیان خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کر لیتی تھی اُس خدا کے نام کی سب سے بڑی بے حرمتی تھی جسے تقریباً تمام مذاہب میں رحمٰن و رحیم کہا گیا ہے۔

مذاہب کا مقصد اگرچہ ان تفرقوں کی دیواروں کو ڈھانا تھا جنہوں نے انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ لیا ہے اور وہ انسانی اخوت کا پرچار کرتے تھے مگر انہیں بھی برادر کشی اور خون ریزی کے لیے آلۂ کار بنایا گیا اور عوام کو ان لڑائیوں میں جھونکنے کے لیے جنت کے وعدے اور دوزخ کی وعیدیں استعمال کی گئیں۔ گویا خدا بھی (العیاذ باللہ) حسن بن صباح کی طرح ہو گیا جو حشیشیوں کو اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے سبز باغ دکھاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ماضی کے کسی بھی دَور کے مقابلے میں آج ہمارے عہد کی جنگ زیادہ تر وحشیانہ اور ہمہ گیر ہو چکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے اور انہیں جنگ و جدال کے نئے طریقوں میں بہت زیادہ مؤثر اور سفاکانہ طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اب یہ بہت زیادہ 'غیر شخصی' اور خوفناک بھی ہوتی جاتی ہے اور ایسی ناقابلِ تصور تباہ کاریاں آناً فاناً پیدا کر سکتی ہے کہ حملہ کرنے والے کو اپنے ہدف مظالم سے ذاتی طور پر واقف ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا جو وہ یہ جان سکے کہ اس نے لاکھوں بے گناہ مرد و زن اور معصوم بچوں پر کیا ظلم ڈھایا ہے؟ یہ بات تو یقیناً بہتوں کو معلوم نہیں ہو سکتی کہ آنے والی نسلوں پر ان وحشیانہ اقدامات کے کیا دُور رس اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے باوجود ایسے احمق، ناعاقبت اندیش، بے حس اور کٹھور انسان بھی ہیں جو خود ہمارے دیش میں بھی بڑی طلاقت لسانی کے ساتھ ایٹم بم بنانے کی حمایت کرتے ہیں تاکہ ہم بھی فلاں اور فلاں ملک کی ہمسری کر سکیں۔ اس کی بجائے یہ نہیں کرتے کہ اپنی اجتماعی قوت کو کام میں لا کر جہاں جہاں ایٹمی اسلحہ کے ذخیرے موجود ہیں انہیں ختم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ساری قومیں موت اور تباہی کے اس چکر کو پھیلاتی جا رہی ہیں اور اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ اسے کبھی استعمال نہیں کریں گی۔

اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انسان نے جو کچھ

ترقیاں کی ہیں، وہ اس کے رگ و ریشے میں پیوست بہیمیت کو ختم نہیں کر سکی ہیں۔ جب بھی اس درندگی کو سازگار ماحول ملتا ہے وہ پھر زندہ ہو کر سر اُٹھانے لگتی ہے۔ پھر بھی یہ سچ ہے کہ خیر سگالی اور رحم دلی کے جذبات کی تبلیغ کرنے والے عظیم اور صاحبِ فکر و نظر مرد و زن، بلکہ بعض حالات میں ان صفات کی حامل پوری پوری جماعتوں نے اس دکھوں بھری زندگی کو ہر زمانے میں باوقعت بنائے رکھا ہے۔ وہ اپنے علاقے اور مذہب کی وفاداریوں سے بلند ہو گئے ہیں مگر کچھ اور بھی زنجیریں ہیں جو ان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ مثلاً رنگ، نسل، عقیدہ، قوم اور قبیلہ--- جن میں وہ بندھے ہوتے ہیں اور جن کے لیے اپنی جان اور آن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ اُن کی خواہش اور کوشش سے ہی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ مفاد پرستوں یا سماجی رجعت پسندوں کا آلۂ کار بھی بن جاتے ہیں جو اُن کی آڑ لے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم 'وطنیت' میں کہا ہے کہ تہذیب حاضر نے نئے نئے بت تراش لیے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

۲۰ ویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ ریمارک کسی کو بہت سخت معلوم ہو سکتا تھا مگر اُس وقت سے اب تک حالات نے ایسی کروٹیں لی ہیں کہ 'قومیت' کا یہ تصور اپنے خالص سیاسی مفہوم میں صرف مذہب ہی کے لیے خطرہ نہیں بلکہ عالمی برادری کی تشکیل اور اس مقصد کے لیے جن رویوں کو اپنانے کی ضرورت ہے اُس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔

انسانی شعور بھی اتنی شدت سے علاقوں میں محصور ہو گیا ہے کہ زیادہ رواداری اور رحم دلی پیدا کرنے کی بجائے یہ انسانوں کو محدود علاقائی وفاداریوں کے سبب پیدا ہونے والے جھگڑوں میں الجھا سکتا ہے۔ دنیا کو تاخت و تاراج کرنے والی کتنی ہی جنگیں ہیں جن میں اس جارحیت پسند تصورِ قومیت نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک قتل و خون پر آمادہ رہنا حب الوطنی کا معیار ہے۔ ایسے لوگ رحم دلی یا مقصدِ انسانیت کا وسیع تر تصور رکھنے کو ''وطن دشمنی'' کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔

لیکن تنگ نظری کی لعنت کا یہ آسیب صرف ہمارے ہی بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف طبقات میں بھی جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بستے آئے ہیں اور جنہوں نے طویل زمانے تک شانہ بشانہ رہ کر کام کیا ہے اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک رہے ہیں، تعصب کا زہر گھول دیا ہے۔ اور وہ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ کچھ افراد یا فرقے کسی دوسری نسل یا رنگ یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے سیاسی نظریات کچھ مختلف ہیں۔ یہ ناروا داری جو قوموں کے روابط پر اثر انداز ہو رہی ہے، اس کی چھوٹ فرقوں کے باہمی تعلقات پر بھی پڑتی ہے۔ اس ذہنیت کی مثالوں کے لیے ہمیں تاریخ میں زیادہ دُور تک جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کا مشاہدہ آج بھی دُنیا کے کسی بھی ملک میں کیا جا سکتا ہے۔ اسے قوم، مذہب، ذات پات، سیاست یا دوسرے اختلافات سے شہ ملتی ہے جنہیں لوگ زیادہ شدت سے اپناتے جا رہے ہیں کیونکہ ہم نے اب تک بھی اپنے اندر وہ رواداری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو مل جل کر زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ہم ان بندھنوں سے چھٹکارا نہیں پائیں گے جو ہمیں فکرِ مستقیم اور انسان دوستی سے روکتے ہیں اور ہمارے نرم و نازک دلوں کو پتھر بنائے دے رہے ہیں اُس وقت تک ہمیں کسی طرح کا حقیقی ارتقاء نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے علاقائی رشتے یا ہم مذہبوں اور ہمسایوں سے ہمارے گہرے تعلقات قابلِ ملامت ہیں، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اگر رکاوٹ بننے لگیں اور انسانیت کے بڑے دھارے اور ہمارے مخصوص فرقے میں تصادم کی صورت پیدا کرنے لگیں تو ہمیں ضرور بروقت چوکنا ہو جانا چاہیے۔ محض اختلافات قابلِ سرزنش نہیں ہوا کرتے کیونکہ ان میں سے بعض مثلاً لسانی، تہذیبی یا فنی اختلافات نے انسان کے ثقافتی ورثے کو مالا مال کیا ہے اور اسے گہری معنویت عطا کی ہے، البتہ نیکی، رواداری اور باہمی مفاہمت کے جذبات میں کوتاہی کرنے سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور مذہب کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان خوبیوں کو پیدا کرنے کی لگاتار کوشش کرتا رہے۔ مگر بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مذہب نے یہ رول صرف کبھی کبھار ادا کیا ہے اور اس کا جتنا الزام تاریخ

کی دوسری قوتوں پر عاید ہوسکتا ہے، فرقہ بندی کے رجحان پر اس کی ذمہ داری اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مذاہب کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہوا ہے۔ دُنیا کے بڑے کلاسیکی مذہبوں کے وجود میں آنے سے پہلے ابتدائی مذاہب نے بھی اپنے اپنے انداز میں انسان کو ذہن ونظر کی وسعتیں عطا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ احساس دلایا تھا کہ انسان کا اس کائنات اور سورج اور ستاروں سے کچھ رشتہ ہے جو اس کی تقدیر پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان میں حیات بعدِ موت کا تصور بھی موجود تھا، جسے وہ اپنے وحشیانہ انداز میں ظاہر کرتے تھے۔ اس کی جھلک ہم تدفین کے ان طریقوں میں دیکھ سکتے ہیں جو مثلاً فراعنہ مصر کے لیے اختیار کیے گئے۔ انہیں ساری روزمرہ استعمال کی چیزوں کے ساتھ دفنایا جاتا تھا جن کے بارے میں خیال تھا کہ اس دنیا میں دوبارہ آتے وقت اُن اشیاء کی ضرورت ہوگی۔ ان ابتدائی تصورات نے بھی انسان کی زندگی کو کچھ نئی معنویت اور گہرائی عطا کی تھی مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور کلاسیکی مذاہب نے ذہنِ انسانی کی تشکیل شروع کی تو نہ صرف بنی نوع انسان میں، بلکہ ساری کائنات میں ایک ربط و اتحاد کا تصور پیدا ہوا۔ لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford) نے بڑی بصیرت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان نے عالمی برادری کا ایک فرد اور ایک آفاقی انسان بننے کا اپنا سفر کس طرح طے کیا ہے۔ تزکیۂ باطن کی مدد سے انسان اپنے آپ کو مقامی جتھوں کی تقدیر سے الگ کرتا ہے اور ایک وسیع تر کائناتی معاشرے کا رکن بن جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ صرف ایک تصور تھا، مگر نئے مقاصد اور نئی بصیرتوں کے ساتھ وہ دل شکن تاریخی تجربات اور زمینی فرقہ بندیوں سے بلند ہوتا گیا۔ اس عمل میں آپ 'شخص' کی پیدائش کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اس متحدہ انسانیت کا ابھرنا ممکن ہوسکا جو اب تک ناقابلِ عبور ثقافتی دیواروں سے بٹی ہوئی تھی۔ اس تبدیلی سے انسان کے وہ زمین اور خون کے رشتے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں جو اسے اپنے محدود ماضی سے وابستہ رکھے ہوئے تھے۔ گویا اب یہ پوری دُنیا اس کا گھر اور سارے انسان اس کے بھائی ہو گئے--- پہلے وہ زمین میں محصور تھا--- آخرکار اُسے اپنی سمت مل گئی اور اب وہ عالمی

برادری کے تصور کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

اب ان کا مقابلہ اقبال کے ان اشعار سے کیجیے:

جرأت ہے تو افکار کی دُنیا سے گزر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

یہاں بھی آپ کو زمان و مکان کی بندشوں کا بے باکانہ انکار ملے گا۔ اقبال نے بھی یہی کہا ہے کہ خارجی طاقتوں کے آگے بے بس ہو کر جھکنا نہیں چاہیے بلکہ اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد قائم رکھنا چاہیے۔

اسلام جس بنیادی نظریے کی تبلیغ کرتا ہے اور اسے ساری دُنیا کے مرد و زن کے ذہنوں میں بسا دینا چاہتا ہے وہ 'امن' کا تصور ہے۔ خود لفظ 'اسلام' جیسا کہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتا ہے 'سلم' سے مشتق ہے جس کے معنی امن و آشتی کے ہیں۔ اس مذہب کا نام 'محمڈن ازم' نہیں ہے جیسا کہ اکثر مستشرقین غلطی سے لکھتے رہے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس مذہب کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ آپ کی تشریح کے مطابق یہ ایسا مذہب ہے جس کی تبلیغ کے لیے آپ مبعوث ہوئے اور جس کا مقصد تمام بنی نوع انسان کے لیے امن و سلامتی کا حصول ہے۔ دُنیا بھر کے مسلمانوں میں سلام کا معروف طریقہ 'گڈ مارننگ' یا 'گڈ ایوننگ' نہیں، بلکہ 'سلام' یا 'السلام علیکم' ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ 'تم پر سلام (سلامتی) ہو' (خواہ تم کوئی بھی ہو)۔ یہی یہودیوں کے سلام 'شیلوم' کا حال ہے۔ قرآن میں بھی اس مذہب کا صرف ایک ہی نام ملتا ہے اور وہ ہے 'اسلام'۔ ارشاد ہوتا ہے:

''ان کے پاس کوئی نئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی رسالت خدا کے پیغمبروں کو ملی ہے، اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے، ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ

رسالت کا کونسا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے...

(الانعام:۱۲۳)

اگر اس آیت کو اس تشریح کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم نے لفظ 'اسلام' کے سلسلے میں پیش کی ہے تو اس سے یہ مطلب ہرگز برآمد نہیں ہوتا کہ سچی ہدایت خود بخود اُس شخص کو مل سکتی ہے جو رسمی طور پر اس مذہب سے وابستہ ہو جائے جسے 'اسلام' کہا جاتا ہے۔ اکثر مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور کسی حد تک یہ اس حدیث کے سبب سے بھی ہوا ہے جس کا پایۂ استناد مشتبہ ہے اور جس میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "من قال لا الٰہ الا اللہ، دخل الجنۃ." اور جس کے مفہوم میں غالباً یہ بات شامل سمجھ لی گئی ہے کہ ''خواہ اس کے اعمال کچھ بھی ہوں۔''

درحقیقت یہ ایک موضوع حدیث ہے کیونکہ قرآن میں ہر جگہ عقیدہ اور عملِ صالح کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اور ہر بار اعمالِ صالحہ کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب 'اسلام' میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> ''بدقسمتی سے اس تعریف کو محض ''تشریعی'' مفہوم میں نہیں سمجھا گیا بلکہ بعد میں یہ بھی سمجھا جانے لگا کہ یہ اسلام کی روح کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب باعتبار ظواہر بنیادی عقیدہ اور اخلاقی معاملات میں اتنا واضح فرق قبول کر لیا جائے گا تو ظاہر پرستی سے بننے والے احساسِ تحفظ کے ہاتھوں دونوں ہی کو نقصان اُٹھانا پڑے گا اور اس کا عام اثر عوام کے سخت رویوں پر یہ ہوا کہ وہ اسلام کے رسمی اور ظاہری پہلوؤں پر اس حد تک زور دینے لگے کہ اُنہوں نے اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو بھی تج دیا ہے۔''

[پہلی قسط] [جاری ہے]